The Pakistan Development Review
41:4 Part II (Winter 2002) pp. 937-966

اقبالؒ کے تمدن دوست معاشی تخیلات

رفیق احمد

تمہید

مشہور ماہر اقتصادیات مینارڈ کینز کا قول ہے کہ سیاسی اور اقتصادی فلسفیوں کے نظریات چاہے صحیح سمت کی طرف رہنمائی کریں یا غلط راستوں پر لے جائیں دونوں حالتوں میں انسانی معاشروں پر انتہائی طاقتور اثرات چھوڑتے ہیں۔ اس لحاظ سے دنیا میں اصل حکمرانی صرف نظریات کی ہوتی ہے شخصیات کی نہیں۔

علامہ اقبالؒ بھی ایک ایسے ہی طاقتور فلسفی ہیں جن کے نظریات نے اور خاص کر فلسفہ خودی نے مردہ قوموں کو زندہ کرنے میں بہت اہم مثبت کردار ادا کیا ہے۔ ان کا 1930ء کا خطبہء الہ آباد پاکستان کی تخلیق کا سبب بنا، موجودہ ایران کے تمام مفکر اور حکمران انہیں اپنا فکری مرشد مانتے ہیں۔ وسطی ایشیاء کی سابقہ روسی ریاستوں میں ان کے خیالات نے ہیجان برپا کر رکھا ہے۔ ان کے تصورات کی بازگشت جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کی تمام قابل ذکر محفلوں میں سنی جا سکتی ہے۔ دنیا کے اکثر تعلیمی اداروں میں مجالس اقبالؒ قائم ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں ان کے خیالات سے استفادہ کیا جائے۔ خاص کر ان کے معاشی افکار سے جو ان کے پورے فلسفہء زندگی کا ایک اہم جزو ہیں۔ ایسا تجزیہ اہل پاکستان کے لئے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ انہی کی متعین کردہ راہ پر چل کر قائداعظم محمد علی جناحؒ نے برصغیر میں بسنے والے دو تہائی مسلمانوں کو آزادی دلوائی۔

عالمی نظریاتی پس منظر

علامہ اقبالؒ کے خیالات کی اہمیت اور نوعیت سمجھنے کیلئے موجودہ عالمی تہذیبی تحریکوں کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔ یوں تو ہر زمانہ کینز کے مندرجہ بالا قول کی صداقت کو ثابت کرتا ہے لیکن دور حاضر میں نظریات کا پھیلاؤ

رفیق احمد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں پروفیسر ایمیریٹس ہیں۔
(Rafiq Ahmad is Professor Emeritus, University of Punjab, Lahore).

اور ٹکراؤ بہت نمایاں ہوگیا ہے۔ بیسویں صدی میں نظریات کا تصادم کمیونزم اور کیپٹل ازم کی شکل میں نمودار ہوا اور کئی فکری اور عملی معرکے سرانجام دینے کے بعد بالآخر سخت جان افغانستانیوں اور پاکستانیوں کے ہاتھوں کمیونزم کے زوال پر منتج ہوا۔ اس زوال کے بعد سمجھا گیا کہ اب اکیسویں صدی میں نظریاتی بالادستی کیپٹل ازم پر مبنی ایک نئے عالمی نظام کو حاصل ہو جائے گی لیکن امریکی سیاسی دانشور ہنٹنگٹن کی نگاہوں میں نظریاتی کشمکش ابھی ختم ہوتی نظر نہیں آتی بلکہ یہ کشمکش بدستور مختلف تہذیبوں کے تصادم کی شکل میں جاری رہے گی اور اس تصادم میں مغربی کیپٹل ازم کا اصل مقابلہ وسیع وعریض علاقوں میں پھیلے ہوئے اسلامی تہذیب وتمدن کے ساتھ ہوگا۔

اس کے برعکس مشہور سیاسی مفکر فیوکویاما کا کہنا ہے کہ نظریاتی جنگ کا تاریخی عمل اب اختتام پذیر ہونے کو ہے اور عنقریب مغربی تہذیب مکمل طور پر فتح یاب ہوگی۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ فیوکویاما کی پیشنگوئی صحیح ثابت ہوتی ہے یا تہذیبی تصادم کوئی اور شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن پچھلی دہائی کے واقعات اور خصوصاً امریکہ کے 11 ستمبر کے سانحہ کے بعد مغرب کھلم کھلا اسلامی تہذیب وتمدن کے خلاف نبرد آزما ہوگیا ہے اور اس نظریاتی تصادم کے اثرات روزمرہ کے ملکی، علاقائی اور عالمی معاملات پر واضح طور پر ظاہر ہو رہے ہیں۔

اگر علم وبصیرت کی گہرائیوں میں جا کر دیکھا جائے تو مغربی اقوام اسلام کے مقابلے میں جس نئے عالمی نظام کا شدومد سے پرچار کر رہیں اس کے پیچھے ایک ایسی نظریاتی بالادستی کے عوامل کارفرما ہیں جس کے عناصر میں آزاد تجارتی منڈیوں کا بے قابو فروغ اور مادی اور عریاں ثقافتی اقدار کی ترویج شامل ہے۔ آزاد بیرونی تجارت کے ہتھیار کا استعمال اس وقت ترقی یافتہ مغربی ممالک کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے کیونکہ وہ آج کل جدید ٹیکنالوجی کے زور پر زیادہ بہتر اور سستی اشیاء پیدا کرنے کی پوزیشن میں ہیں اور اس طرح دنیا میں مالی اور معاشی طور پر دیرپا بالادستی حاصل کرسکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نظر کو خیرہ کرنے والی تہذیبی چمک اور نقش ونگار کی عریانی مغرب کی ثقافتی بالادستی کی راہ بھی ہموار کر رہی ہے لیکن رنگ ونسل کے امتیاز کے سبب اور باطنی اعتبار سے مغربی معاشرہ خود بھی شکست و ریخت کا شکار ہو رہا ہے اور جہاں کہیں اس کا سایہ پڑتا ہے وہاں بھی مختلف انواع کی غیر ہمواریاں اور نفسیاتی دڑاریں پیدا کر رہا ہے۔ اس ابھرتے ہوئے نوآبادیاتی سیاسی اور ثقافتی نظام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلامی دنیا ہے جو تیل اور دوسرے قدرتی وسائل کی بہتات، ذات پات اور رنگ ونسل سے مبرا نظریات، اور اخلاقی اور روحانی اقدار کی وجہ سے اصلاح پذیر ہونے اور آگے بڑھنے کے بے پناہ امکانات رکھتی ہے۔ افغانستان، عراق، فلسطین اور کشمیر سے متعلق حالیا امریکی پالیسیوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مغربی قوتیں اس وقت جلدی میں ہیں کہ پیشتر

اس سے کہ اسلامی ممالک آئندہ دس بیس برس میں قوت پکڑیں انہیں جائز یا ناجائز حربے استعمال کر کے ابھی سے دبوچ لیا جائے۔

دنیائے اسلام کی کشمکش

یہ ہے وہ عالمی نظریاتی پس منظر جس کے حوالے سے ضروری ہو گیا ہے کہ اسلامی دنیا بالعموم اور پاکستان بالخصوص اپنے اسلامی نظریات اور روحانی اقدار سے نہ صرف از سرِ نو شناسائی حاصل کرے بلکہ اس ورثہ کو نئی نسلوں تک پہنچانے کا اہتمام کرے۔ پاکستان کا تو وجود ہی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اپنی الگ شناخت کا مرہونِ منت ہے۔ اس شناخت کی آبیاری جن عوامل نے کی ہے ان کی حفاظت و پرورش کرنے والوں میں سرفہرست علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ ہیں۔ ان دونوں عظیم رہنماؤں نے آنے والے دور میں قوموں کی نظریاتی اساس کی اہمیت کا بہت پہلے ہی احساس کر لیا تھا۔ اسی لئے قائداعظمؒ نے اسلامیہ کالج پشاور میں 13 جنوری 1948ء کو برملا اعلان کیا تھا کہ پاکستان کا مطالبہ ایک ٹکڑۂ زمین حاصل کرنے کیلئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔ لہٰذا اس دور کے عالمی نظریاتی تناظر میں پاکستان جو ایک نظریاتی مملکت ہے اس بات کا مکلّف ہے کہ وہ اس تناظر کو سمجھے اور اس میں اپنا مقام پیدا کرے۔

اس سلسلے میں ایک مشکل پیش آسکتی ہے کہ پاکستان کو ایک جدید اسلامی ریاست بنانے کیلئے کون سی حکمت عملی اختیار کی جائے۔ اس حوالے سے کئی نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ قوت واقتدار حاصل کر کے متشددانہ طریقے سے اسلام نظام حیات نافذ کیا جائے۔ لیکن اس میں مخالفانہ ردعمل پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ دوسرا طریقہ ایسی حکمت عملی اختیار کرنے کا ہے جو افراد اور معاشرے میں قلب و ذہن کی تبدیلی پیدا کر کے باطنی انقلاب برپا کرے۔ اس حوالے سے احیائے اسلام کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے افکار زیادہ مؤثر، ہمہ گیر اور دیرپا اثرات کے حامل ہیں کیونکہ ان میں اسلامی طرز حیات کو قوت واقتدار کے ذریعے نافذ کرنا شامل نہیں ہے۔ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی انسان کی ذات اور اس کے حوالے سے اس کی تہذیب وتمدن کی حفاظت اور پرورش کے گرد گھومتا ہے۔ یہ مقصد اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں معاشرے کی ہمہ گیر اصلاح کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں "پیامِ مشرق" کے دیباچے میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں: "مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب

برپا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندورنی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔"

اقبالؒ کے یہ خیالات دراصل اس روحانی جمہوریت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا ذکر انہوں نے الہیات اسلامی کی تشکیل نو کے چھٹے خطبے میں کیا ہے۔ پاکستان میں جس قسم کی جمہوریت بانیان پاکستان کے پیش نظر تھی وہ مغربی جمہوریت کے مروجہ تصورات سے کہیں اعلیٰ اور ارفع ہے۔ یہ روحانی جمہوریت پاکستان میں قائم کر کے ہم ایک ایسی جدید اسلامی ریاست قائم کر سکتے ہیں جو دور حاضر میں اسلام کا ایک عظیم اور نیا ترجمان بنے۔ ایرانی مفکر ڈاکٹر علی شریعتی کے نزدیک اقبالؒ کے افکار کے مطابق ڈھلا ہوا پاکستان صرف مسلمانوں یا مشرق ہی کی ضرورت نہیں بلکہ عالم بشریت کی ضرورت ہے۔

تعمیر ذات انسانی کا تمدنی پہلو

اگرچہ علامہ اقبالؒ معروف معنوں میں ماہر معاشیات نہیں تھے لیکن ان کے فلسفیانہ اور عمرانی نظریات کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس کے اندر انسان کے معاشی مسئلہ کو ایک مؤثر منطقی انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبالؒ نے جو خیالات پیش کئے ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ معاشی فلاح و بہبود کا مقصد انسان کی ذات اور اس کے حوالے سے ان کی تہذیب و تمدن کی حفاظت اور پرورش ہے۔ انسان کی بڑی تسخیری قوتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے جسے بروئے کار لانے کے لئے انسانی ذات کی نشو و نما ضروری ہے۔ اس کیفیت کو اقبالؒ خودشناسی، خودآگہی یا خودی کی جامع اصطلاع سے ظاہر کرتے ہیں۔

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسم زماں و مکاں توڑ کر
خودی شیر مولا، جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تری یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا

لیکن ان تسخیری قوتوں سے اس لئے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا کیونکہ خودی کی تعمیر کے راستے میں کئی تمدنی اور معاشی رکاوٹیں موجود ہیں مثلاً استحصالی سیاست، معاشی اونچ نیچ اور غربت اور غیر روحانی سماجی ساخت۔ ان رکاوٹوں کو اسلام کی تعلیمات کی مدد سے دور کیا جا سکتا ہے۔ یہ تعلیمات خالصتاً توحید کے گرد گھومتی ہیں اور انسان کو ایک دوسرے کے استحصال سے آزاد کرتی ہیں، اس آزادی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ غربت ہے۔ اقبالؒ کے اپنے الفاظ ہیں:

"ذرا خیال کرو۔ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر بہت اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود عدم برابر ہو جاتا ہے"
(علم الاقتصاد۔ صفحہ ۳۰)

ماہرین اقتصادیات بہت مدت تک اپنے علم کی فنی حدود سے باہر نہیں نکلے۔ لیکن اب اس حقیقت کو تسلیم کیا جا رہا ہے کہ معاشی اور تمدنی صحت مندی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صرف طلب اور رسد کے جابرانہ قوانین ہی اہمیت نہیں رکھتے انسانوں کی معاشی پس ماندگی کو دور کرنا بھی علم اقتصادیات کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ علم معاشیات کی وہ شاخ جسے ترقیاتی معاشیات کہا جاتا ہے اور جو دوسری جنگ عظیم کے بعد معرض وجود میں آئی انسانوں کی فلاح و بہبود کو آزاد منڈیوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے موزوں حکومتی مداخلت کی حامی ہے تاکہ نوع انسانی کو کم از کم بھوک اور جہالت سے محفوظ رکھ کر تمدنی ارتقاء کے تقاضے پورے کئے جا سکیں۔ زندگی کے معیار کو بہتر بنانے کا تصور اسی نقطۂ نظر کا غماز ہے۔

ایک اہم نکتہ

نیو یارک یونیورسٹی کے معیشت دان مائیکل ٹوڈارو نے تو واضح طور پر تسلیم کیا ہے کہ اچھی زندگی عزت نفس (Self-esteem) سے عبارت ہے اور یہ عزت نفس غربت سے نجات اور معاشی ترقی کے حصول کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح مجموعی قومی آمدنی کے تصور کو ترقی کا پیمانہ سمجھنے کی بجائے اب انسانی ترقی (human development) یا انسانی وسائل کی ترقی (Human Resources Development)۔ ایسی اصطلاحات استعمال کی جارہی ہیں۔ لیکن یہ اصطلاحات بھی انسانی ذات کی نشوونما اور اہمیت سے مبرا ہیں کیونکہ ان میں بھی اچھی زندگی کو متوقع عمر، آمدنی اور تعلیم تک محدود کردیا گیا ہے۔ جب کہ رنگ، نسل اور مذہبی تعصبات سے بالاتر اور اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار سے بھرپور رویوں کے بغیر کوئی انسانی معاشرہ صحیح معنوں میں خوشیاں محسوس نہیں کرسکتا۔

معاشی ڈھانچے

ظاہری طور پر اقتصادی ڈھانچہ کتنا ہی خوشنما اور عظیم الشان کیوں نہ ہو اگر وہ مجموعی مفلسی کو دور کر کے ایک پرسکون اور جبر واستبداد سے پاک تمدنی زندگی کی طرف رہنمائی نہیں کرتا تو معدوم ہوسکتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہر جاندار وجود کی طرف اقتصادی نظام کا وجود بھی دو بنیادی اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک بیرونی جسمانی ڈھانچہ اور دوسرا اس کے اندر بسنے والی تمدنی روح۔ اگر روح بیمار ہو تو بیرونی ڈھانچے کی چمک دمک محض نگاہ کا دھوکا ہوتی ہے۔

حال ہی میں روس اور مشرقی یورپ کے اقتصادی ڈھانچے کو جو دھچکا پہنچا ہے وہ اسی حقیقت کا غماز ہے۔ خود پاکستان کی اقتصادی تاریخ بھی یہی گواہی پیش کرتی ہے۔ 1960ء کی دہائی میں ہمارا بیرونی اقتصادی ڈھانچہ بظاہر خوبصورت انداز میں تعمیر ہورہا تھا۔ نئی نئی صنعتیں اور بینک، تعلیمی اور زرعی اصلاحات، بیرونی امداد اور سرمایہ کاری، قومی عمارات کی تعمیر، یا اور اس قسم کے کئی معاشی پروگرام تیز رفتاری سے عملی جامہ پہن رہے تھے۔ لیکن اندر سے قومی روح بے چین تھی۔ انفرادی اور علاقائی معاشی ناہمواریاں پیدا ہورہی تھیں، امیری اور غریبی کا تفاوت بڑھ رہا تھا۔ چند خاندانوں نے مالی اور عمومی معاشی پالیسیوں کا رخ اپنے مفادات کی حفاظت اور فروغ کی طرف موڑ رکھا تھا۔ غربت اور بے روزگاری کے مسائل دن بدن پیچیدہ ہورہے تھے۔ سرمایہ دار، جاگیردار، بیوروکریسی اور فوجی افسر مل کر قومی تقدیر کے مالک بنے ہوئے تھے۔ جمہور بے بس تھی۔ نتیجہ کیا نکلا۔ دس سال سے تعمیر ہونے والا خوشنما اقتصادی ڈھانچہ 1960ء کی دہائی کے آخری سالوں میں دھڑم سے نیچے آ گرا اور اپنے ساتھ مشرقی پاکستان کو بھی

دفن کر گیا!

کچھ اس قسم کی صورت حال اس وقت بھی ہے۔ دس سالوں سے ظاہری طور پر جو معاشی ڈھانچہ تعمیر ہو رہا ہے اس کی بنیادیں نج کاری (privatisation)، غیر ضروری، سرکاری پابندیوں سے آزادی (deregulation) اور قومی صنعتوں کی پرائیویٹ ہاتھوں میں فروخت (denationalisation) پر رکھی گئی ہیں۔ یہ تصور عام ہے کہ منڈیوں کو آزاد کرنے سے معیشت خود بخود ترقی کرے گی۔ زر اور ملکی اور غیر ملکی سرمائے کی آزادانہ نقل و حرکت سے ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی۔ اس سلسلے میں ایسی مالیاتی، تجارتی، صنعتی اور زرعی پالیسیوں پر عمل درآمد بھی شروع ہو چکا ہے جو مختلف معاشی شعبوں کو متحرک کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن کیا محض ان اقدامات سے عامۃ الناس ان معاشی الجھنوں سے آزاد ہو رہے ہیں جن سے ان کی تمدنی شخصیت کے ابھرنے کے امکانات پیدا ہوں۔ کیا غربت، بے روزگاری، مہنگائی اور علاقائی، مقامی اور انفرادی ناہمواریوں کے دردناک نظارے کم ہو رہے ہیں۔ آزاد معیشت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عوام کے تعلیمی، طبی اور رہائشی مسائل موجودہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ تمدن کی موجودگی میں بطریق احسن حل کر دے گی ایک خیال خام معلوم ہوتا ہے۔ اگر بیرونی معاشی ڈھانچے کی مطلوبہ تعمیر ہو بھی گئی اور بڑے بڑے کارخانے، شاہرائیں اور بجلی گھر معرض وجود میں آ بھی گئے تو تمدنی فروغ کے نقطۂ نظر سے لاحاصل ہونگے اگر ان کا ثمر مفلسی اور معاشی اونچ نیچ کے مکمل خاتمہ کی شکل میں نہ نکلا۔

معیشت اور تمدن

یہی وہ عوامل ہیں جو معیشت اور عمرانی قوتوں کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں اور جن کے حوالے سے اقبالؒ کا معاشی تجزیہ اہمیت رکھتا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

> " تمام علوم کا موضوع ذات انسان ہے جو خصوصیت کے ساتھ علم تمدن کا موضوع ہے۔ کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے۔ یا یوں کہو کہ ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ تمدنی لحاظ سے ہوتا ہے۔ دولت ہی کو لے لو۔ اگر یہ شے ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد

نہیں دے سکتی تو پھر اس کا کیا فائدہ؟"
(علم الاقتصاد، صفحہ ۵۹)

اقبالؒ کے اس قول سے ہمیں جو بصیرت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ مجموعی قومی دولت (GNP) کے فروغ اور تقسیم کے منصوبے اور پالیسیاں بناتے وقت ہمیں انسانی ذات کی تعمیر اور صحت مند تمدنی ارتقاء کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس سلسلے میں ان کے اپنے الفاظ میں پہلا کام یہ کرنا چاہیے کہ "ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو۔ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کیلئے صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے (علم الاقتصاد۔ صفحہ ۳۱)

آج کل دنیائے اسلام میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً یہ تحریک زور پکڑ رہی ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح معاشی شعبے کو بھی اسلامی سانچے میں ڈھالا جائے تا کہ اخوت و مساوات کی بنیاد پر ایک خوشحال معاشرہ معرض وجود میں آئے۔ اس سلسلے میں اقبالؒ کے خیالات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ صرف اسلامی تعلیمات ہی کے عظیم مفکر نہیں تھے بلکہ وہ اپنے عہد کی فکری اور معاشی تحریکوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ ان کے نظریہ تمدن اسلام کی گہری چھاپ ہے۔ لہذا ان کے معاشی افکار کا مطالعہ اسلامی نظام معیشت کے حوالے سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معیشت کے نام سے ہونے والی علم اقتصادیات کی نئی شاخ ابھی تک اقبالؒ کے تمدنی نظریہ معیشت سے زیادہ استفادہ نہیں کر سکی۔ اس شاخ کے ماہرین کے لئے اقبالؒ کے خیالات ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں اور آگے بڑھنے کیلئے اجتہادی دروازے بھی کھولتے ہیں۔

اقبالؒ کی معاشی تحریریں

اقبالؒ کے معاشی افکار کی وسیع تر تمدنی اہمیت جاننے کے بعد اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ان افکار کی نوعیت کیا ہے۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ وسیع تر تمدنی فروغ کے حوالے سے معاشی عوامل کی اہمیت واضح کی بلکہ ان کی تصنیفات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے علم معاشیات کا مطالعہ کرنے میں خاص محنت سے کام لیا اور اپنے دور کے معاشی نظریوں اور مسائل پر اس قدر عبور حاصل کر لیا کہ اپنے تصورات کی روشنی میں ان پر تنقیدی نگاہ ڈال سکیں۔ انہوں نے اپنے مشہور و مربوط فلسفہ خودی کی طرح کوئی مربوط معاشی نظریہ تو وضع نہیں کیا لیکن وہ اپنی زندگی کے فکری ادوار میں شروع سے آخر تک معاشی مسائل پر نثر اور نظم دونوں میں برابر خیال افروز اظہار رائے کرتے

رہے۔اقبال کے معاشی افکار ان کی بہت سی تحریروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ان کی پہلی باقاعدہ تصنیف علم الاقتصاد کے نام سے 1903ء میں شائع ہوئی۔علم اقتصادیات پر یہ غالباً اردو کی پہلی تدریسی کتاب تھی جو اپنے دور کے مروجہ نظریات کی عکاسی تھی۔ اس میں کہیں کہیں انیسویں صدی کے مشہور امریکی ماہر اقتصادیات فرانسس واکر (1840-1897) اور تھامس مالتھس (1834-1822) کے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔البتہ جابجا اقبالؒ نے اپنی جدت فکر کے مظاہرے بھی کئے ہیں۔مثلاً علم معاشیات کا ایک اہم مفروضہ یہ ہے کہ انسان کی معاشی زندگی خودغرضی سے عبارت ہے۔اقبالؒ نے اسے خودغرضی اور ایثار دونوں کا امتزاج قرار دیا ہے گویا کہ خالص معاشی عامل کے ساتھ تمدنی عنصر بھی شامل کردیا ہے۔اس کے علاوہ خاندانی منصوبہ بندی اور قومی صنعتی تعلیم کے معاشی ثمرات بھی کتاب کے اہم موضوعات ہیں جو اس دور کے حوالے سے ساٹھ ستر برس کی فکری پیش رفتی ظاہر کرتے ہیں۔

اقبالؒ کی جن نثری تحریروں میں معاشی معاملات پر رائے زنی کی گئی ہے ان میں مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

۱۔ **قومی زندگی:**
یہ مضمون اکتوبر 1904ء کے ماہنامہ مخزن لاہور میں شائع ہوا۔

۲۔ **ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر:**
یہ لیکچر 1901ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں دیا گیا۔

۳۔ **1911ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں مسلمانوں کے بارے میں ایک تجزیاتی رپورٹ:**
1927ء اور 1930ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں کی گئیں مختلف تقاریر۔

۴۔ خطبہ الہ آباد 1930ء

۵۔ خطبہ لاہور 1932ء (آل انڈیا مسلم کانفرنس)

۶۔ نومبر 1936ء کے رسالہ الحکیم لاہور میں ضبط تولید پر تحریر اور

۷۔ 1936ء اور 1937ء میں ارسال کردہ قائداعظمؒ کے نام اہم تاریخی خطوط۔

اس کے علاوہ ان کے مکاتیب۔ مکالمے اور مختلف موقع پر دیئے گئے بیانات بھی کافی اہم معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

ان کی اردو اور فارسی کی بے شمار نظمیں اور اشعار بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ زندگی کے معاشی پہلو کے بارے

میں ان کے جذبات واحساسات کی بہت عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔ خضر راہ، لینن خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت، اشتراکیت، کارل ماکس کی آواز اور ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ یہ ان کی چند مشہور نظمیں ہیں جن میں ہم عصری معاشی تحریکوں پر بھر پور تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامہ میں کئی مقامات پر اقبالؒ نے اپنی معاشی رائے کا اظہار کیا۔

اقبالؒ کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کی تمام اہم معاشی تحریکوں سے باخبر تھے۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ جدید علوم معاشیات پانچ فکری تحریکوں سے عبارت ہے۔ جن کی اعلیٰ الترتیب کلاسیکل، نیوکلاسیکل، کارل مارکس، کینز اور جدید امتزاجی نظریات کے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اقبالؒ کا دور پہلی تین تحریکوں پر محیط تھا۔ وہ ان تینوں تحریکوں کی جزیات سے آشنا تھے۔ یہ تفصیلات کا مقام نہیں۔ اقبالؒ کی تمام نثری تحریروں اور نظموں پر مفصل تبصرے کیلئے ایک طویل نشست درکار ہے۔ یہاں ان کے خیالات کا لب لباب پیش کرنا مقصود ہے جس کے مندرجہ ذیل اجزا قابل غور ہیں۔

اقبالؒ نے اپنے دور کے مختلف معاشی مسائل وامور پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے بارے میں ایک اہم نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے۔ انہیں ان مسائل سے متعلق علم اقتصادیات کی اصولی یا نظریات بحثوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ ان کی توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے تمدنی ماحول تمام استحصالی اور معاشی رکاوٹوں سے پاک ہو۔ چنانچہ ان کے سامنے جب بھی کوئی معاشی مسئلہ آیا چاہے اس کا تعلق زراعت سے تھا یا صنعت سے یا تعلیم سے یا محصولات سے یا آبادی سے یا کسی اور شعبہ سے انہوں نے اس کا جائزہ اپنے فلسفہ تمدن کے حوالے سے کیا اور اس سلسلے میں رائے دی۔

دل خراش مفلسی

اقبالؒ کو جہاں کہیں بھی اور جس اقتصادی نظام میں انسانی ذات کے فروغ کے حوالے سے رکاوٹیں نظر آئیں ہیں ان کی مذمت کی ہے اور انہیں دور کرنے پر زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ دل خراش رکاوٹ مفلسی پیدا کرتی ہے۔ ان کے خیال میں اس کی ذمہ داری اس نظام پر ہے جس پر جاگیردار، سرمایہ دار اور استحصال پسند طبقہ چھایا ہوا ہے۔ یہ طبقہ مختلف شکلوں اور رنگوں میں حتیٰ کہ حکومتی، مذہبی اور فرقہ وارانہ تنظیموں کی صورت میں بھی کارفرما ہے۔

نسل، قومیت ، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
(لینن خدا کے حضور میں)

اشتراکیت

اشتراکیت کے بارے میں بھی اقبالؒ نے اسی نقطۂ نگاہ سے اظہار خیال کیا ہے۔اس بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک سرمایہ داری کے خلاف اشتراکیت کی دشمنی کا تعلق ہے اقبالؒ اس کی بھرپور حمایت کرتے ہیں اور غریب طبقوں سے روا رکھی جانے والی بے انصافیوں اور سرمایہ داروں کی حیلہ گریوں کے وضاحت سے پیش کرتے ہیں۔لیکن جب اشتراکی طرز حکومت جبر واستبداد اور انسانی ذات کی نفی پر اتر آئی تو اقبال نے اس کی بلا روک ٹوک مذمت کی:

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
(بال جبریل)

لیکن اس کے باوجود اشتراکیت کے وہ عناصر جو انسان کو مفلسی سے نجات دلاتے ہیں اقبال کی نظر میں قابل تقلید ہیں بشرطیکہ وہ انسانی ذات کو فروغ دینے والے اس دائرے میں آ جائیں جو اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہے۔میرے خیال میں یہی مطلب ہے اقبال کے مندرجہ ذیل مشہور فارمولے کا:

بالشوزم + خدا = اسلام

لیکن یہ ایک عمومی فارمولا ہے۔اس کی تفصیلات طے کرنا ابھی باقی ہیں۔اشتراکیت کا نظام روس اور مشرقی یورپ میں پوری تفصیلات کے ساتھ نافذ کیا گیا اور مرکزی منصوبہ بندی کے تحت بہت سے اقدامات کئے گئے۔ان میں کون سے اقدامات اور پالیسیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق تھیں اور کون سی مطابقت نہیں رکھتی تھیں ان پر کوئی قابل ذکر تحقیق نہیں کی گئی۔مجموعی طور پر اقبال کے ہاں ہمیں جو تصور ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اشتراکیت ایک مکمل

نظامِ فکر کی حیثیت سے قابلِ قبول نہیں البتہ اس کے بعض بنیادی تصورات سے وہ ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

کیپٹل ازم

اقبال کے نزدیک جدید نظام سرمایہ داری یا کیپٹل ازم بھی اپنی اندرونی اور بیرونی استحصالی کاروائیوں کی وجہ سے قابلِ مذمت ہے خاص کر اس لئے کہ اس نے اقوامِ عالم کو اپنے نو آبادیاتی اور استعماری پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ نظام پردۂ تہذیب میں غارت گری اور آدم کشی کا مجرم ہے۔ البتہ اقبال سرمایہ کی زبردست معاشی افادیت کے منکر نہیں۔ سرمایہ ایک نہایت اہم عامل پیدائش ہے اور اس میں روز افزوں اضافہ انفرادی اور مجموعی ترقی کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن کیپٹل ازم کا نظام اپنی مکمل شکل میں ایک انسان دوست تمدن کے فروغ کا باعث نہیں اور اکثر و بیشتر خود اپنے معاشروں میں بھی مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ 1930ء کی دہائی میں اس نظام کے ہاتھوں جو عالمی بحران پیدا ہوا اور خود مغربی اقوام کی جو درگت بنی اس کا حوالہ لینن کی زبان میں ان اشعار میں ہے:

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کی لئے مرگِ مفاجات
(لینن خدا کے حضور میں)

اس میں شک نہیں کہ پچھلے بیس سالوں میں امریکہ، یورپ اور مشرقی ایشیا بالخصوص جاپان میں نئے انداز کا ایک زبردست صنعتی اور فنی انقلاب برپا ہوا ہے لیکن ابھی تک دنیا کی دو تہائی آبادی غربت و افلاس کی پستیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ادارہ یو این ڈی پی کی سالانہ Human Development Reports کے مطابق عالمی دولت کے 80 سے 85 فیصد حصہ پر چند مغربی اقوام قابض ہیں اور امیر اور غریب اقوام کا اقتصادی تفاوت روبہ اضافہ ہے۔ اس صورتِ حال میں ذمہ داری مکمل طور پر سرمایہ دارانہ نظام پر ہے۔

فقہ کی تدوینِ نو

انسانوں کی معاشی اور تمدنی مسائل کا تسلی بخش حل اقبال کے نزدیک اسلامی فقہ کی تدوینِ نو میں ہے۔

فرماتے ہیں: "خوش قسمتی ہے (معاشی مسائل) کا حل اسلامی قانون کے نفاذ اور جدید نظریات کی روشنی میں اس کے مزید فروغ میں موجود ہے۔ اسلامی قانون کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو ہر شخص کا بنیادی معاشی ضروریات کا حق محفوظ ہو جاتا ہے۔ (قائداعظمؒ کے نام خط مورخہ 28 مئی 1937ء)۔ یہ وہی حق ہے جسے آج کل بنیادی ضروریات (basic needs) کا حق کہتے ہیں۔

اس قسم کے حق کو محفوظ کرنے کیلئے اقبالؒ نے سوشل ڈیما کریسی یعنی اشتراکی یا معاشرتی جمہوریت کے نظام کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

> "اسلام کیلئے اشتراکی یا معاشرتی جمہوریت کو مناسب تبدیلیوں کے
> ساتھ اور اسلام کے قانونی اصولوں کے مطابق اختیار کر لینا کوئی
> انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع ہوگا۔"
> (مذکورہ بالا خط)

واضح رہے کہ ان خیالات کا اظہار اقبالؒ نے اپنی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے قائداعظمؒ کے نام ایک خط میں کیا تھا۔ یہ ان کے عمر بھر کے وسیع مطالعہ کا ماحصل تھا۔ زندگی نے اقبالؒ کو اس امر کی مہلت نہ دی کہ وہ فقہ اسلامی کی تشکیل نو کا کام اسی ناقدانہ انداز میں سرانجام دیں جس طرح اس سے پیشتر وہ الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل نو کے سلسلہ میں کر چکے تھے۔ آج کل اسلامی معیشت کے موضوع کا بہت چرچا ہے۔ اور دنیا بھر میں اس پر ۲ ہزار سے زائد تحقیقی کتب اور مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک لحاظ سے اقبالؒ معاشیات کی اس نئی شاخ کے بانی ہیں۔ انہوں نے عہد حاضر کے معاشی مسائل پر اسلامی اقدار کی روشنی میں جا بجا اپنی آراء کا اظہار کیا۔ اگر چہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اسلامی معیشت کے تحت اب تک جن خیالات کو فروغ حاصل ہوا ہے وہ اگر زندہ ہوتے تو اپنی اجتہادی بصیرت کی روشنی مین ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے۔

اسلامی تعلیمات میں جو مقام اجتہاد کو حاصل ہے اقبالؒ نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ خاص کر شریعت اسلامی کے تمدنی اور معاشی پہلوؤں کے حوالے سے۔ ان کو یہ پر مغز تحریر اسلامی معیشت کے ماہرین کیلئے قابل توجہ ہے۔ فرماتے ہیں: "فقہا کے استدلالات جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعت اسلامی کہا جاتا ہے ایک نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصول کی بناء پر جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کئے ہیں ان میں سے

اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کیلئے واقعی مناسب اور قابل عمل تھے۔ مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں۔ اگرچہ شیعہ مفسروں نے بعض اصولوں کی تشریح میں ایک حیرت انگیز وسعت نظر سے کام لیا ہے تاہم جہاں تک میرا علم ہے شریعت اسلامی کی جو توضیح جناب ابوحنیفہؒ نے کی ہے ویسی کسی مفسر نے آج تک نہیں کی۔ قانون اسلامی کی جدید تفسیر کیلئے ایک بہت بڑی فقیہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بنائر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظّم کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعیت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔ اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے۔" (قومی زندگی۔ صفحہ 42) ظاہر ہے کہ اقبال کی یہ خواہش ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔

ترقیاتی عوامل

غربت و افلاس کو دور کرنے اور معاشی خوشحالی کو عامتہ الناس کی تقدیر بنانے کیلئے اقبالؒ نے اپنی تحریروں میں جن عوامل پر خاص طور پر زور دیا ہے ان پر آج کل عام بحث ہو رہی ہے لیکن ان کے زمانے میں لوگ ان عوامل سے زیادہ باخبر نہ تھے۔ اس سلسلے میں چھ نکات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

اول: نوجوانوں کو صنعتی، فنی اور تجارتی تعلیم سے آراستہ کرنا تاکہ وہ محدود سرکاری ملازمتوں کیلئے سرگرداں ہونے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکیں۔

دوم: عورتوں کی تعلیم اور تمدنی ترقی کیلئے مناسب تدابیر اختیار کرنا خاص کر دیہاتی عورتوں کی فلاح و بہبود کیلئے۔ اس کے علاوہ حقوق نسواں کی اشاعت اور حفاظت کیلئے موزوں تدابیر پر عمل کرنا اس لئے کہ مرد صرف اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے لیکن عورت پورے خاندان پر اثر انداز ہوتی ہے۔

سوئم: با استطاعت لوگوں کو ترغیب دینا کہ وہ پسماندہ شہری اور دیہاتی علاقوں میں نجی انجمنیں قائم کر کے لوگوں کے مسائل حل کریں۔ یہ وہی ادارے ہیں جنہیں آج کل NGOs کہتے ہیں۔

چہارم: صنعتی ترقی کیلئے بھرپور کوشش کرنا۔ اقبالؒ نے اس سلسلے میں جاپان کی تیز رفتار ترقی کو

سراہتے ہوئے اس کے مطالعے پر زور دیا ہے۔ ان کا فرمانا ہے کہ " جاپان کا مہذب اقوام میں شمار ہونا اس لئے نہیں کہ انہوں نے بڑے بڑے فلسفی یا شاعر ادیب پیدا کئے ہیں بلکہ جاپانی عظمت کا دار و مدار جاپانی صنعت پر ہے۔" (قومی زندگی)۔

پنجم: نشہ آور اشیاء اور مشروبات کی درآمد کو روکنا کیونکہ یہ انسان کی ذات کو فنا کر دیتے ہیں۔

ششم: ان تاریخی روایات، عادات، اوہام اور اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنا جو ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں اور ان عوامل کی نشاندہی جو اقتصادی قوت پیدا کرتے ہیں۔

عمومی معاشی پسماندگی

اقبالؒ نے مختلف تحریروں میں ہندوستان کی عمومی معاشی پسماندگی کا بھی تجزیہ کیا ہے اور اس سلسلے میں مندرجہ ذیل بڑی بڑی وجوہات کی نشاندہی کی ہے۔ تعلیمی پس ماندگی، صنعت سے بے توجہی، تجارت پر مغربی سوداگروں کا قبضہ، افزائش آبادی اور سکہ کی ناموافق شرح تبادلہ جس کی وجہ سے بیرونی منڈیوں سے ہندوستانی خام مال کی کم قیمت وصول ہوتی ہے اور اس کے برعکس انگلستان سے درآمد کردہ صنعتی اشیاء ہندوستان میں مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔

وسطی ایشیا کے ساتھ روابط

اقبالؒ کی دور رس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ ایشیا کے مسلم ممالک آزادی سے ہم کنار ہونے والے ہیں لہذا انہوں نے متعدد مقامات پر ان ممالک کے مابین باہمی معاشی اور تمدنی روابط کے فوائد کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کو وسطی ایشیاء کی جدید ابھرتی ہوئی تنظیم تعاون برائے ترقی کا ایک پیش رو مفکر سمجھنا چاہیئے۔

زمین کی ملکیت

ملکیت زمین کے بارے میں اقبالؒ کا یہ نظریہ تھا کہ نہ تو حکومت اس کی قطعی مالک ہے اور نہ افراد۔ زمین صرف خداوند کریم کی ملکیت ہے اور حکومت وقت اجتماعی مفاد کیلئے اس کی امین اور منتظم ہے۔ حکومت زمین کے بارے میں صرف انتظامی اقدامات کر سکتی ہے اور کاشتکاری کیلئے فعال مزارعین یا کسانوں کو دے سکتی ہے۔ اگر اقبال

کے اس نظریہ پر عمل کیا جائے تو جاگیرداری اور زمینداری نظام ختم ہو جاتا ہے اور فی الواقعہ کاشت کرنے والے عام کسانوں کی معاشی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔

عملی اقتصادی تجاویز

پنجاب کونسل کی رکنیت

اقبالؒ نے معاشی زندگی کے بارے میں محض فلسفیانہ خیالات کا اظہار نہیں کیا بلکہ انہیں جب بھی موقع ملا اپنے خیالات سے مطابقت رکھنے والی عملی تجاویز بھی پیش کیں۔ یہ مواقع انہیں خاص طور پر پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا ممبر منتخب ہونے پر ملے۔ ان کی رکنیت کا زمانہ 1927ء سے 1930ء تک تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے وقتاً فوقتاً جو تقاریر کیں اور صوبائی میزانیوں پر تنقید کے دوران جو عملی تجاویز پیش کیں وہ انتہائی دوررس نتائج کی حامل تھیں۔ ان تجاویز کا مقصد معیشت کے عادلانہ فروغ کیلئے ایک ایسا بنیادی ڈھانچہ (infrastructure) مہیا کرنے تھا جس سے غربت، جہالت اور بے روزگاری دور کرنے میں بہت مدد ملتی اور حکومت کی پالیسیوں کا رخ دیہات اور شہروں میں بسنے والے مفلس لوگوں کی فلاح و بہبود کی طرف مڑ جاتا۔ اس کے علاوہ انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کے استحصال کی مختلف شکلوں کے خاتمہ کا امکان بھی پیدا ہو جاتا۔ یہ تجاویز اپنے زمانے سے کئی دہایاں آگے تھیں۔ اسی لئے ہم عصر جاگیردارانہ نوآبادیاتی حکومت کیلئے ناقابل قبول تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تجاویز آج بھی معاشی اور سماجی ترقی کیلئے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اور ان کی بنا پر کئی اصلاحات نافذ کی جا سکتی ہیں۔ یہاں اقبال کی چیدہ چیدہ تجاویز کا ذکر کیا جاتا ہے:

1. بے زمین کسان

ملک کی آبادی کا غالب حصہ دیہات میں بستا ہے لیکن یہ صدیوں سے زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم چلا آ رہا ہے۔ لہذا اقبالؒ کی نظر کم از کم سرکاری زمینوں کے استعمال کا حق صرف غریبوں اور بے زمین کسانوں کو ملنا چاہیئے۔ تمام قابل کاشت سرکاری زمین مفلس کاشتکاروں میں بانٹ دینی چاہیئے اور انہیں کاشتکاری کے سلسلے میں تمام مطلوبہ سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں۔ جب حکومت نے ضلع منٹگمری (ساہیوال) کے نیلی بار کے علاقہ میں تین لاکھ

ستر ہزار ایکڑ زمین بڑے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کی تو اقبالؒ نے اس کی سخت مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ نصف رقبہ مزارعین کو آسان شرائط پر دیا جائے۔ بدقسمتی سے اس اصول پر ابھی تک معمولی حد تک عمل ہوا ہے۔

2. کاشتکاری کا حق

اقبالؒ کے نزدیک زمین کا مالک اللہ تعالی ہے (الارض اللہ)۔ اسلامی شریعت کے اس اصول کی روشنی میں زرعی زمین صرف ان زمینداروں کے پاس رہنی چاہیے جو اس کی کاشت کر سکیں۔ فقہ اسلامی میں تو کاشت کرنے کی مہلت تین سال تک ملتی ہے۔ اس عرصہ میں اگر کوئی زمیندار کاشت نہ کرے تو حکومت یہ زمین اس سے لے کر کسی دوسرے کاشتکار کو دے سکتی ہے۔ ملکیت اور کاشتکاری کا یہ انقلابی اصول ہر قسم کی جاگیرداری اور وڈیرہ ازم پر ضرب کاری لگاتا ہے اور اس کا معاشی فائدہ یہ ہے کہ تمام قابل کاشت زمینیں زرکاشت آجاتی ہیں بشرطیکہ مطلوبہ سہولتیں دستیاب ہوں۔ اس کا لازمی نتیجہ زرعی پیداوار میں اضافہ کی شکل میں نکلتا ہے۔

3. دیہاتی ماحول

اقبالؒ کے خیالات میں دیہات کا ماحول صاف ستھرا بنانے کیلئے حکومت اور نجی انجمنوں کو بھرپور پروگرام بنانے چاہئیں۔ صاحب استطاعت لوگ انجمنیں بنائیں۔ نوجوانوں کی تنظیمیں دیہات میں جاکر بہتر زندگی گذارنے کا شعور پیدا کریں۔ اقبالؒ کی یہ سوچ آج کے ماحولیاتی نقطۂ نظر کے عین مطابق ہے۔

دیہات میں طبی سہولتوں کا شدید فقدان ہے۔ خاص کر عورتوں کی ضروریات کے حوالے سے۔ اس سلسلے میں اقبالؒ نے ایلوپیتھی کے ساتھ ساتھ مشرقی طب کے احیاء پر خاص زور دیا ہے اور ملک کے اندر ہی موزوں دوائیوں کی تیاری اور تحقیق کیلئے ادارے قائم کرنے کی ضرورت اجاگر کی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک یونانی اور آریوویدک ہمارے علاقوں کی بیماریوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں اور ارزاں ہونے کی وجہ سے مفلس لوگ انہیں بآسانی خرید سکتے ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں تحقیقاتی لیبارٹریاں قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ان کی 22 فروری 1938ء کی تقریر انہی خیالات کی عکاسی کرتی ہے۔

4. خواتین کی تعلیم

اقبالؒ کی تجاویز میں جا بجا عورتوں کی تعلیم وتربیت اور اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ اقبالؒ کے خیال میں مرد کی مصروفیات زیادہ تر اپنی ذات تک محدود ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس عورت سارے خاندان کیلئے فکر مند ہوتی ہے۔ لہذا عورتوں کی حالت سنوارنے سے خاندانوں اور معاشروں پر وسیع پیانے پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اقبالؒ نے حکومت وقت پر بار بار زور دیا کہ عورتوں کو طبی، تعلیمی، اور دیگر سہولتیں ترجیحی بنیادوں پر مہیا کی جائیں اور اس مقصد کیلئے بجٹ میں وافر مقدار میں رقومات مختص کی جائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی ہماری خواتین بہت پس ماندہ اور بے بس ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس معاملے میں پچھلے دس سالوں میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے صورت حال اقبال کے دور سے زیادہ مختلف نہیں۔

مرکزی حکومت نے عورتوں کے مسائل کے حوالے سے ایک محکمہ قائم کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد نجی انجمنیں اور ادارے بھی مفید کام کر رہے ہیں لیکن یہ کوششیں ناکافی ہیں۔ پاکستان کی نصف آبادی عورتوں پر مشتمل ہے لیکن انتظامیہ، عدلیہ اور مقنّنہ میں انہیں بہت کم نمائندگی حاصل ہے۔ کس حد تک اب اسمبلیوں میں عورتوں کی نمائندگی میں اضافہ ہوا ہے۔ سماجی معاملات میں بھی عورتوں کے بے بسی اور استحصال کے واقعات ہر روز اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ عورتوں کے معاملے میں اقبالؒ کی پر زور تحریروں کی روشنی میں بیداری پیدا کرنے والے اور فلاح و بہبود میں اضافہ کرنے والے بھرپور پروگرام مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

5. جدید تعلیمی تقاضے

تعلیم کے بارے میں اقبالؒ کے خیالات انتہائی جدید ہیں۔ ان کی رائے میں نوجوانوں کو عام تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی، صنعتی اور انتظامی علوم سے آراستہ کرنا چاہیئے۔ اور انہیں ان ممالک کی اقتصادی اور فنی کاوشوں سے آگاہ کرنا چاہیئے جو ترقی وتعمیر کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت کی خاص ذمہ داری ہے کہ وہ بجٹ میں ایسے ادارے کثرت سے قائم کرے جو نوجوانوں کو ہنر مند بنائیں اور سرکاری ملازمتوں کے پیچھے بھاگنے کی بجائے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی ترغیب دیں۔

جہاں تک عامتہ الناس کی تعلیم ہے اقبالؒ نے حکومت وقت پر متعدد بار زور دیا کہ عام جبری تعلیم کا قانون نافذ کرے اور اس سلسلے میں مؤثر اور قابل عمل حکمت عملی وضع کرے۔ جو لوگ اس قانون پر عمل نہ کریں ان کے خلاف

تادیبی کاروائی کی جائے۔

اقبالؒ نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں 5 مارچ 1927ء اور 4 مارچ 1929ء کو سالانہ میزانیوں پر اظہار رائے کرتے ہوئے تعلیم کے بارے میں حکومت کی عمومی بے حسی کی سخت مذمت کی اور اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ تعلیم کے میدان میں کوئی ترقی نہیں ہو رہی۔ اساتذہ کی تعداد ضرورت سے کم ہے۔ طلبہ کی اکثریت ابتدائی سالوں میں پڑھائی چھوڑ دیتی ہے اور بہت کم طالبہ سیکنڈری، پروفیشنل اور ووکیشنل درجوں تک پہنچتے ہیں۔ اقبالؒ نے حکومت پر زور دیا کہ وہ انتظامی اخراجات کم کرے عمومی اور پروفیشنل تعلیم کیلئے زیادہ رقومات فراہم کرے۔ اقبالؒ کے دور میں متحدہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن اسلامی مدرسوں کو سرکاری گرانٹ کا صرف ایک چوتھائی حصہ ملتا تھا۔ اقبالؒ نے متعدد بار اس امتیازی سلوک کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور پس ماندہ علاقوں کے تعلیمی اور سماجی فروغ پر زور دیا۔

6. زرعی انکم ٹیکس

زرعی آمدنی پر مؤثر طریقے سے انکم ٹیکس لگانے کا مسئلہ ابھی تک اٹکا ہوا ہے۔ اقبالؒ نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں 5 مارچ 1927ء اور 23 فروری 1928ء کو اپنی تقاریر میں مالیہ کو انکم ٹیکس کی طرح وصول کرنے پر زور دیا۔ ان کے خیال میں مالیہ کا مروجہ طریقہ انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ ہر زمیندار کو مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے چاہے وہ بڑی زمین کا ملک ہو یا چھوٹی زمین کا۔ اس کے برعکس انکم ٹیکس ہر شخص ادا نہیں کرتا۔ اس کی زد صرف ان لوگوں پر پڑتی ہے جن کی آمدنی ایک خاص سطح سے زیادہ ہو۔ کاشتکاری بھی آمدنی کا ذریعہ ہے اس لئے مالیہ کا انتظام انکم ٹیکس کی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے۔ اقبالؒ نے تجویز پیش کی کہ پانچ بیگھے زمین تک زمین کے مالکوں سے مالیہ وصول نہ کیا جائے۔ اس طرح غریب کسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد مالیہ کے بوجھ سے محفوظ ہو جائے گی اور صرف استطاعت رکھنے والے زمیندار ہی اسے ادا کریں گے۔

اقبالؒ کی تجویز پر حکومت کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا کہ کسانوں کی ایک بڑی تعداد کو مالیہ سے مستثنیٰ کرنے سے حکومت کو آمدنی کم ہو جائے گی۔ اسکے جواب میں اقبالؒ نے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت نظم و نسق کے اخراجات میں کمی کرے اور زراعت پر انکم ٹیکس تدریجی اصول کے مطابق لگائے۔ یعنی زیادہ آمدنی حاصل کرنے والے زمینداروں پر انکم ٹیکس کی شرح زیادہ ہونی چاہیئے۔

ہوسکتا ہے کہ اقبالؒ کی یہ تجویز کہ پانچ بیگھے تک کے مالکان زمین کو مستثنیٰ کیا جائے نظرثانی کی محتاج ہو لیکن جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ انکم ٹیکس کے بارے میں اقبالؒ کے خیالات نہ صرف جدید اصول معاشیات کے مطابق ہیں بلکہ ان غریب کسانوں کا فائدہ مقصود ہے جو ملک کی آبادی میں اکثریت رکھتے ہیں اور انسان کی حیثیت سے جن کی ذات کا فروغ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ معاشی طور پر خوش حال بھی ہوں اور تمدنی طور پر آزاد بھی۔

7. وراثت ٹیکس

محصولات کے نظام کے حوالے سے اقبالؒ کی ایک اہم تجویز یہ تھی کہ موت یا وراثت ٹیکس عائد کیا جائے جسے جدید اقتصادی اداب میں inheritance tax, death duty یا estate tax کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اقبالؒ کا یہ کہنا تھا کہ اگر کوئی شخص بیس یا تیس ہزار روپے سے زیادہ کی مالیت کی جائیداد وراثت میں حاصل کرے تو اس پر ایک خاص شرح سے ٹیکس عائد کیا جائے۔ اقبال کے دور کے بیس ہزار آج کل کے بیس لاکھ سے کیا کم ہونگے۔

دنیا کے اکثر و بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں وراثت ٹیکس عائد ہے اور اس کا جواز یہ ہے کہ متوفی اپنی جائیداد قومی تحفظ کے ماحول کے اندر رہ کر ہی بناتا ہے لیکن اس کے چھوڑے ہوئے مال و متاع میں ورثاء کی اپنی کمائی کا حصہ نہیں ہوتا۔ یہ ٹیکس عام طور پر زیادہ مالیت کی جائیداد پر لگایا جاتا ہے۔ لہذا یہ دولت کے بہت زیادہ ارتکاز کو روکتا ہے۔ پاکستان میں بھی یہ ٹیکس عائد تھا لیکن ایک دہائی قبل امراء کے اصرار پر اسے ختم کر دیا گیا تھا۔ پاکستان میں ارتکاز دولت کا عمل زور شور سے جاری ہے۔ آج کل کے حالات متقاضی ہیں کہ وراثت ٹیکس کا پھر اجراء کیا جائے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یہ ٹیکس ساٹھ ہزار ڈالر سے زائد مالیت والی وراثت پر لگایا جاتا ہے اور متوفی کی ہدایات کی روشنی میں ضروری اخراجات نکالنے کے بعد جائیداد کی باقی مالیت پر تدریجی شرح سے وصول کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وراثت کی قابل محصول مالیت کے پہلے پانچ ہزار ڈالر پر 3 فیصد، ایک سے اڑھائی لاکھ ڈالر کی مالیت پر 30 فیصد، 20 سے 25 لاکھ ڈالر کی مالیت پر 69 فیصد اور ایک کروڑ ڈالر سے زائد مالیت پر 77 فیصد کے حساب سے وراثت ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ امریکہ کے علاوہ اور بہت سے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں بھی وراثت ٹیکس لگایا جاتا ہے اگرچہ اس کی وصولی کے پیمانے اور شرحیں مختلف ممالک میں مختلف ہیں۔

8. صنعتی فروغ

اقبالؒ نے اپنی تحریر وتقریر میں صنعتی ترقی کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔خاص کر اس لیے کہ صنعتوں کے فروغ سے بے روزگاری میں کمی واقع ہوتی ہے اور غربت کی لعنت کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔انہوں نے اس سلسلے میں زراعت سے تعلق رکھنے والی صنعتوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ حکومت اس معاملے میں قطعاً کوئی توجہ نہیں دے رہی۔

9. ناکام سرکاری میزانیے

پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں اقبالؒ کی آخری تقریر غالباً وہ تھی جو انہوں نے 7 مارچ 1930ء کو 31-1930 کے بجٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کی تھی۔اس تقریر میں انہوں نے حکومت کے انتظامی اخراجات کو خاص طور پر ہدف تنقید بنایا اور یہ ثابت کیا کہ حکومت پنجاب کا بجٹ مسلسل خسارے کا اس لیے شکار ہو رہا ہے کیونکہ افسر شاہی کے اخراجات بڑھ گئے ہیں اور مروجہ نظام لوگوں کی فلاح و بہبود کے نقطہ نظر سے بالکل ناکام ہو گیا ہے۔اس نظام نے جو گوناگوں مسائل پیدا کیے ہیں ان میں سرفہرست پانچ لعنتیں ہیں۔ بے روزگاری، بھوک اور ننگ، فرقہ وارانہ جھگڑے، مقروض لوگوں کی تعداد میں اضافہ اور خسارے پر مبنی میزانیے۔اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہیے اور اگر فی الحال یہ ناممکن ہو تو اس پر اٹھنے والے اخراجات کم کر دینے چاہئیں کیونکہ یہ نظام نہ علوم وفنون میں اضافہ کا باعث ہے اور نہ ہی ملک کو صنعتی ترقی کی طرف لے جا رہا ہے۔حکومتی مشینری معاشرہ پر سراسر بوجھ ہے۔بہتر ہے کہ اس کو برقرار رکھنے پر کم سے کم خرچ کیا جائے۔اقبالؒ کی اس اہم تقریر میں چند سرکاری اراکین نے کئی بار مداخلت کی مگر انہوں نے اپنے مافی الضمیر کا کھل کر اظہار کیا۔

سچ تو یہ ہے کہ اقبالؒ کا یہ تبصرہ آج کل کے حالات پر بھی صادق آتا ہے۔ہمارے میزانیوں کے بڑھتے ہوئے خسارے اور اس کے باوجود معاشی اور سماجی مسائل میں ہوش ربا اضافہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مروجہ نظام اقتدار نقائص سے لبریز ہے اور یہ اس بات کا حاجت مند ہے کہ اس کی ساخت بدلی جائے اور اسے چلانے والوں کے کردار وافکار کو اقبالؒ کے انسان دوست فکری سانچوں میں ڈھالا جائے۔

قائداعظمؒ اور اقبالؒ

علامہ اقبالؒ نے قائداعظمؒ کے نام اپنے مشہور خطوط میں مسلمانوں کے معاشی حالات سدھارنے کیلئے جو بار بار زور دیا تھا شاید اس کا اثر تھا کہ ان کی وفات کے چھ سال بعد قائداعظمؒ نے ماہرین پر مشتمل ایک منصوبہ بندی کمیٹی بنائی اور ان کو مندرجہ ذیل رہنما اصول دیا:

"آپ معاشی مسائل کا جو بھی حال پیش کریں ان میں یہ بنیادی نکتہ پیش نظر رکھیں۔ ہمارا مقصد امیروں کو امیر تر بنانا نہیں ہے اور نہ چند اشخاص کے ہاتھوں میں دولت کو مرتکز ہونے کے عمل کو تیز کرنا ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ عام لوگوں کے معیار حیات کو ہموار کریں۔ مجھے امید ہے کہ کمیٹی اس اہم نکتہ پر پوری توجہ دے گی۔ ہمارا نصب العین سرمایہ دارانہ نظام نہیں بلکہ اسلام ہے اور لوگوں کے مفادات اور فلاح کو مجموعی حیثیت سے ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔"

(پاکستان بنکر۔جنوری۔جون 1993)

مندرجہ بالا اقتصادی منصوبہ بندی کمیٹی 3 اگست 1944 کو بنائی گئی تھی اور تیس افراد پر مشتمل تھی۔اس کمیٹی نے ایک بیس سالہ اقتصادی پروگرام مرتب کرکے 2 جولائی 1945ء کو قائداعظمؒ کے حوالے کردیا تھا۔ پروگرام کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کمیٹی نے افلاس، بے روزگاری، جہالت اور معاشی پس ماندگی سے نجات حاصل کرنے کیلئے دوررس تجاویز پیش کی تھیں اور بہت حد تک یہ انہی خیالات کی عکاس تھیں جو قائداعظمؒ نے متذکرہ صدر خطاب میں پیش کیے تھے۔تفصیلات میں جائے بغیر یہ بات بالکل واضح ہے کہ خود قائداعظمؒ پر اقبالؒ کے خیالات کی گہری چھاپ تھی۔قائداعظمؒ نے متذکرہ بالا خطوط کے پیش لفظ میں اس کا برملا اعتراف کیا ہے۔

غریب پرور بجٹ

دو دستاویزات

دو اور دستاویزات ایسی ہیں جو اقبالؒ کے معاشی خیالات کی بالواسطہ عکاسی کرتی ہیں۔ ایک متحدہ ہندوستان کا آخری بجٹ جو خان لیاقت علی خان نے وزیرخزانہ کی حیثیت سے مارچ 1947ء کو پیش کیا تھا۔اسے غریب پرور بجٹ کا نام دیا گیا کیونکہ اس بجٹ کی تجاویز کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ ٹیکسوں کا بوجھ امراء پر ڈالا جائے اور اس طرح جو رقم حاصل ہو اسے غریبوں کی حالت سدھارنے پر خرچ کیا جائے۔دوسری دستاویز پاکستان کا پہلا پنج سالہ

منصوبہ (1960-1955) ہے۔ اسے مرتب کرنے میں دیگر ماہرین کے علاوہ ایم ایل قریشی مرحوم کا بھی ہاتھ تھا جو قائداعظمؒ کی 1944 میں مقرر کردہ منصوبہ بندی کمیٹی کے جائنٹ سیکریٹری رہ چکے تھے۔ یہ منصوبہ بہت سی انقلابی تجاویز پر مشتمل تھا جن میں دوررس زرعی اصلاحات پر بھی زور دیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے پاکستان کے سیاسی حالات نے اس منصوبے کی تکمیل نہ ہونے دی ورنہ ہمارے موجودہ معاشی حالات کا نقشہ مختلف ہوتا۔

خلاصہ بحث

نیا اندازِ فکر

اقبالؒ کے معاشی افکار اور تجاویز کا جو سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے اس سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے معاشی مباحث سے پوری طرح باخبر تھے البتہ انہیں علم معاشیات کی فنی باریکیوں سے زیادہ سروکار نہ تھا۔ ان کے فلسفیانہ اور مذہبی خیالات کا محور انسان کی ذات تھی جس کی حفاظت اور نشوونما پورے معاشرے کی ذمہ داری تھی۔ ان کی عظیم الشان فکری تخلیق ان کا نظریہ خودی تھا لیکن خودی کے فروغ وفراغ کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ مفلسی تھی۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کے خواہاں تھے جو غربت و جہالت سے پاک ہو اور جس میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو۔

کس نہ باشد درجہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبین این است و بس

اس مقصد کے حصول کیلئے علم معاشیات کا مطالعہ ضروری تھا تاکہ ان عوامل کا پتہ لگایا جاسکے جو قوموں کو معاشی خوش حالی سے ہمکنار کرتے ہیں۔ اقبالؒ نے علم معاشیات سے یہی کام لیا اور اس علم کے طرز استدلال کی مدد سے اپنے وسیع تر تمدنی اور تہذیبی دائرہ فکر کے لیے معاشی بنیادیں فراہم کیں۔ یا یوں کہیے کہ انسان کی معاشی زندگی کو اس کی تمدنی زندگی کے تناظر میں دیکھا۔ علم معاشیات کے مباحث کو سمجھنے کا یہ ایک نیا اندازِ فکر ہے جو ہمیں اقبالؒ کے ہاں ملتا ہے۔

جدید علم معاشیات میں اس تمدنی اندازِ فکر کی گنجائش موجود ہے۔ درحقیقت معاشیات ایک ایسا متحرک عمرانی علم ہے جو پچھلی دو صدیوں سے انسانی معاشرے کے بدلتے ہوئے معاشی اور سائنسی ماحول کے حوالے سے نئے نئے نظریات وضع کرتا رہا ہے اور اس سلسلے میں اس نے دوسرے علوم سے استفادہ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معاشی نظریات کو غیر تغیر پذیر عقائد کا درجہ حاصل نہیں۔ مشہور بزرگ ماہر اقتصادیات الفرڈ مارشل کہتے ہیں:

"معاشی نظریہ ایسے طے شدہ نتیجہ پر مشتمل نہیں ہوتا جسے فوری طور عملی تدابیر کے سانچہ میں ڈھالا جاسکے۔ اسے عقیدے کا درجہ دینے کی بجائے ایک طرز استدلال سمجھنا چاہیئے یعنی ذہن کا ایسا آلہ کار یا سوچ بچار کا ایک ایسی فنی عمل جو اپنے عامل کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد دے۔" (حوالہ 19) اقبالؒ نے طرز استدلال تو معاشیات کا استعمال کیا ہے لیکن نتائج تمدنی نوعیت کے اخذ کیے ہیں۔

علم سیاست مدن

معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں انہوں نے اسلام کے زمانہ عروج کے ماہرین عمرانیات و اخلاقیات سے بھی استفادہ کیا ہے جو معاشی نظریات و مسائل کو علم سیاست مدن کا حصہ سمجھتے تھے۔ اقبالؒ نے اپنی تصنیف علم الاقتصاد کے عنوان کے نیچے قوسین میں یہ الفاظ درج کیے ہیں۔ وہ علم "جس کا معروف نام علم سیاست مدن ہے" یہ معروف نام مسلمان ماہرین عمرانیات کا ایجاد کردہ ہے۔ راقم الحروف نے اقبالؒ کی یہ کتاب پہلے پہل دیال سنگھ کالج لائبریری میں 1950ء کے اوائل میں دیکھی تھی اور قوسین کی عبارت سے متاثر ہو کر عربوں کی اقتصادی تصانیف پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا تھا جو پاکستان اکنامک جرنل کی اپریل 1953ء کی اشاعت میں چھپا تھا (حوالہ 20) اس میں باقی باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تیرہویں صدی عیسوی کے نامور محقق محمد بن حسن طوسی کی کتاب "اخلاق ناصری" میں ایک پورا باب علم سیاست مدن پر ہے جو انسان کی معاشی زندگی پر تمدنی نقطہ نظر سے بحث کرتا ہے۔ بعد کے مسلمان مصنفین نے بھی بشمول ابن خلدون سیاست مدن پر اظہار خیال کیا ہے اور اس کے معاشی مضامین کو اخلاقیات کی کسوٹ پر پرکھا ہے۔ البتہ اقبالؒ کے ہاں تمدنی نقطہ نظر ایک مکمل فلسفہ کی شکل میں اجاگر ہوا ہے اور انہوں نے معاشیات سے تمدن کے تعلق کو ایک بالکل نئے انداز میں پیش کیا ہے جس کی زیر نظر مقالے میں وضاحت کی گئی ہے۔

جدید ترقیاتی معاشیات

اقبالؒ نے اپنے افکار میں جن معاشی مسائل پر نسبتاً زیادہ توجہ دی ہے ان میں افلاس و جہالت سے نجات

اور معاشی ترقی کا حصول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے علم معاشیات کی کتب میں ان مسائل پر کسی مربوط انداز میں بحث نہیں کی جاتی تھی اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی نظریئے یا فارمولے مرتب کیے گئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم نے یورپی استعمار پرست طاقتوں کو کمزور کر دیا جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی بے شمار ایشیائی اور افریقی ممالک آزاد ہو گئے اور یہ امید پیدا ہو گئی کہ اب ان ممالک کے کروڑوں غریب عوام معاشی طور پر خوشحال ہو جائیں گے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ معلوم ہوا کہ معاشی ترقی کے راستے میں کئی رکاوٹیں ہیں مثلاً وسائل اور سرمائے کی کمی، آبادی کا دباؤ، ہنرمندی اور علوم وفنون کا فقدان اور صنعتی پس ماندگی۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے بھرپور اقدامات کرنے پڑیں گے۔ ماہرین اقتصادیات بھی مجبور ہو گئے کہ روایتی معاشی نظریات سے ہٹ کر غربت و افلاس پر قابو پانے کیلئے نیا انداز فکر اختیار کریں۔ یہی وہ پس منظر تھا جس نے علم معاشیات کی ایک نئی شاخ کو جنم دیا جسے ترقیاتی معاشیات کہتے ہیں۔

اگرچہ بنیادی معاشی اصولوں کا ڈھانچہ برقرار رہا لیکن ترقیاتی معاشیات نے اس کے اوپر نظری مباحث اور عملی تجاویز کی ایک الگ عمارت تعمیر کی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ترقیاتی معاشیات پر بے شمار کتابیں، رپورٹیں اور تجزیاتی مقالے لکھے جا چکے ہیں اور سب کے موضوعات یہی ہیں کہ غربت کو کیسے دور کیا جائے؟ آمدنیاں کیسے بڑھائی جائیں؟ پیداوار میں کیسے اضافہ ہو؟ اور انسان کی زندگی کا معیار کیسے اونچا کیا جائے؟ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبالؒ کے سامنے بھی یہی مسائل تھے اور ان کی عملی تجاویز کا رخ انہی مسائل کو حل کرنے کی طرف تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ترقیاتی معاشیات کے مباحث کا دائرہ بہت وسیع، مربوط اور فنی باریکیوں سے پر ہے لیکن اقبالؒ کے دور کا علم معاشیات اس معاملے میں تنگ داماں تھا۔

منتخب کتابیات

شیخ محمد اقبال۔ علم الاقتصاد، کلیات اردو، کلیات فارسی۔ لاہور: اقبال اکادمی۔

شیخ محمد اقبال (۱۹۷۰) قومی زندگی اور ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ لاہور: آئینہ ادب۔

شیخ عطاء اللہ (۱۹۶۱) اقبال نامہ۔ لاہور: شیخ محمد اشرف تاجر کتب۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (۱۹۷۴) مسائل اقبال۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی (باب ۱۸۔ "کیا اقبال اشتراکی تھے")۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل (۱۹۸۶) قبال اور جدید دنیائے اسلام۔ لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت۔ (باب دوازدہم۔ " اشتراکیت کا مسئلہ ")

بیدار ملک (۱۹۸۸) اقبال شناسی اور کریسنٹ۔ لاہور: بزم اقبال۔ (Dr. Taseer Iqbal; Modern Problems')

ڈاکٹر صدیق جاوید (۱۹۸۹) " علم الاقتصاد۔ ایک عمرانی مطالعہ " اقبال، بزم اقبال کا سہ ماہی مجلّہ۔ صفحہ ۸۱۔۹۷۔

محمد حنیف رامے (۱۹۷۰) اقبال اور سوشلزم۔ لاہور: البیان۔

محمد حنیف شاہد (۱۹۷۷) اقبال اور پنجاب کونسل۔ لاہور: مکتبہ زریں۔